ڈاکٹر غلام اصغر
استاد، شعبہ اُردو، اقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور
ڈاکٹر لیاقت علی
استاد، شعبہ اُردو، اقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور

علامہ اقبال کا نظریۂ قومیت و وطنیت: نظری اور ہندوستانی تناظر میں

Dr. Ghulam Asghar
Assistant Professor, Department of Urdu Iqbaliyat, Islamia University, Bahawalpur.
Dr. Liaqat Ali
Associate Professor, Department of Urdu Iqbaliyat, Islamia University, Bahawalpur.

Allama Iqbal's Theory of Nationality and Patriotism: In Theory and in the Indian Context

Nationalism is a subjective ideology which varies under shadows of situations and territories; hence word “Nation” possesses non static meaning. In this Article authors tried to define the meaning of “Nation” and “Nationalism” in Colonial Hindustan with the perspective of Allama Iqbal. He is the National Poet of Pakistan. His name is taken as a nationalist basing upon his ethno-religious ethnicity. Article discusses him as a person having broad spectrum about Nationalism and Nationality along with its doctrine and philosophy. His Nationalism ideology was also non static, it developed continual and gradually with the time demand & requirements. The article covers his Nationalism ideology in theoretical & Combined Indian perspective.

Key Words: *Allama Iqbal, Ideology Territories, Nation, Nationalism, Hindustan, Poet.*

کسی اجتماعی مقصد یا مقاصد کے حصول کے لیے کمربستہ ہو جانے والے لوگ ایک قوم کہلاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں قوم کے لیے لفظ Nation استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ لاطینی اسم Natio سے ماخوذ ہے جو کہ کلاسیک لاطینی فعل Nasci سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے جس کے معنی ہیں ”To be born from“ اسی سے ہی مزید اسم Nativus اور Native نکلے ہیں۔[1] ان تمام الفاظ کا بُنِ معنی و مصدر عمومی طور پر "پیدائش" سے متعلق ہے یا ایسا متلازم گروہی لفظ جو ابتدا میں ایک نسل کے لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا لیکن اصطلاحاً اس کے معنی ایک

ایسی جماعت کے ہیں، جس کی جائے پیدائش ایک ہو، قطعِ نظر اس کے کہ وہ جگہ چند درجن یا ہزاروں مربع میل پر پھیلی ہوئی ہو۔ اسی لیے زمانۂ وسطیٰ کی یورپی یونیورسٹیوں میں Nation کا اطلاق طلبہ کے اُس گروہ پر کیا جاتا تھا جو کسی ایک علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔(۲) امتدادِ زمانہ کے ساتھ، نسل و علاقہ، سے نسبت بدل گئی لیکن پیدائش کا حوالہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گھر سے گاؤں اور ملک تک پھیلتا ہوا سلسلۂ وطن، قوم کی تعریف میں بھی وسعت پیدا کرتا چلا گیا۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے قوم کی تعریف کے لیے کہا:

> "قوم کا لفظ گویا انسان کے لیے وہی معنی رکھتا جو لفظِ جنس حیوان کے لیے۔ نوعِ انسان کی مختلف اقوام اسی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور ان کے خصائص ویسے ہی صاف اور بیّن ہیں جیسے اجناسِ حیوانی کے۔ اِن خصائص میں اصولی امر یہ ہے کہ یہ بذریعہ وراثت کے اَبًا عَن جَدٍ پہنچتی ہیں۔"(۳)

اِس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ قوم کسی حادثے سے تخلیق نہیں ہو سکتی، چاہے وہ ایک جماعت پر مشتمل ہو یا کثیر جماعتوں پر، اُس کے اتصال قومی کے لیے جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ چند ایسے خصائص ہیں جو اولاد کو ورثے میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہ توارث بقول ریناں زمانے کی تینوں حالتوں پر جاری رہتا ہے کہ قومیت ایک روحانی اصول کا نام ہے۔ اس کے دو اجزا ہیں جو مل کر ایک بن جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق ماضی سے ہے اور دوسرے کا حال سے۔ ایک طرف اجتماعی یادداشت کی عظیم وراثت ہے تو دوسری طرف ایک معروضی اتفاقِ رائے اور مل کر رہنے کی خواہش تاکہ اس اجتماعی ورثے سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔(۴) یہی وہ نفسیاتی ساخت ہے جو اسٹالن کے نزدیک قومیت کا غالب عنصر ہے۔ یہی وہ قومی کردار ہے جو نسلاً بعد نسل ورثے میں منتقل ہوتا ہے اور قوم کے استحکام و دوام کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اسٹالن کے یہ قول:

> "قوم انسانوں کے ایک ایسے پائیدار و مضبوط گروہ کا نام ہے جس کے ارتقا و عروج میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو اور جس کے اندر اشتراکِ زبان، اشتراکِ ارض اور اشتراکِ معاش پایا جاتا ہو اور ساتھ ہی اُس کی نفسیاتی ساخت بھی ایک ہی ہو۔ وہ نفسیاتی ساخت جس کا اظہار تہذیبی اتحاد اور اشتراک کی صورت میں ہوتا ہے۔"(۵)

اِس تناظر میں قومیت وہ ذہنی رویہ یا نفسیاتی ساخت ہے جو افراد کی کسی ایک جماعت یا جماعتوں کو کسی ایک یا دوسرے اجتماعی داعیہ یا مقصد کے تحت مربوط و متحد قوم بنا کر اُس کے قومی کردار کا ایسا تعین و تشخص اُبھارے جو اُسے دوسری قوم یا اقوام سے ممتاز کرے۔ جیسا کہ جیلانی کامران نے بیان کیا:

> "انسانی تاریخ نے جدید زمانے میں انسانوں کے جس تشخص کو نمایاں کیا ہے اور جس کی نسبت سے لوگوں کی عالمی پہچان ظاہر ہوئی ہے، اسے قومیت کا نام دیا گیا ہے۔"[۶]

نظریۂ قومیت نوعیت کے لحاظ سے ایک جذباتیت یا عصبیت کا نام ہے جو اتحادِ باہمی کا سبب بنتا ہے۔ اس دائرے میں وہ لوگ آتے ہیں جو مشترک تاریخ، مشترک فتوحات اور متحدہ کوشش کے بنیاد پر بقیہ طائفۂ انسانی سے الگ اور ممتاز ہو کر اپنا تشخص بنا لیتے ہیں۔ یعنی یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی ایک محور یا نکتے پر ایک رائے رکھتے ہیں۔ اِس گروہ کا اجتماعی شعور ولاشعور ایک ہے۔ یہ وجہ اِن کے درمیان بھائی چارہ اور وحدت کی اکائی تشکیل دیتی ہے اور اِس اتحادِ باہمی کے ہیشگی اور مضبوطی کے لیے اِس وجہ کا ہمیشہ باقی رہنا ایک لازمہ ہے۔ قومیت کے حوالے سے لاسکی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ ایک گروہ ہوتا ہے جس کی تخلیق مشترک تاریخ، مشترک فتوحات اور متحدہ کوشش کے نتیجے میں بننے والی روایات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ یوں انسانوں میں بھائی چارے کا ایسا مضبوط جذبہ پروان چڑھتا ہے جو ان کو وحدت کے رشتہ میں مضبوطی سے منسلک کر دیتا ہے۔ وہ دوسرے افراد کے مقابلے میں اپنی پسند و ناپسند کو نمایاں حیثیت دینے لگتے ہیں۔ ان کا معاشرتی ورثہ واضح طور پر ان کا اپنا ورثہ قرار پاتا ہے۔ وہ ایک ایسے فن و ادب کے حامل ہو جاتے ہیں جو دوسری اقوام سے مختلف اور ممتاز قرار پاتا ہے۔[۷] اسی قومیت کو غلام احمد پرویز نے یوں بیان کیا ہے:

> "نیشنلزم کے لیے بالعموم دو شرائط جزو لاینفک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک باہمگی (Gregariousness) اور دوسرے جذبۂ بے ہمگی (Exclusiveness)۔ ثانی الذکر جذبہ سے مقصود یہ ہے کہ ایک نیشن اپنے آپ کو خود مختار تصور کرتی ہے اور کسی اور نیشن کے فرد کو نہ اپنے اندر شامل کرتی ہے اور نہ ایسے حق دیتی ہے کہ وہ ان کے معاملات میں دخل اندازی کرے تا آں کہ وہ اپنی قومیت نہ بدل لے۔"[۸]

یعنی اس کا ایک معنوی پہلو یہ نکلا کہ قومیت ایسا طلسم ہے جو ایک طرف اتحاد کا باعث بنتا ہے تو اُسی جگہ یہ تنافر کا سبب بھی بن رہا ہوتا ہے۔ اسے ہم یوں سمجھ لیں کہ قومیت کے بقا کے لیے ایک طرف ہیرو کا وجود لازم ہوتا ہے اور دوسری طرف دشمن کا ہونا بھی ناگزیر ٹھہرا۔ ایک طرف ہمیں دائرے کے اندر محبت اور مرکز مائل قوت درکار ہوتی ہے اور دوسری طرف ہمیں نفرت اور پریشر فورس چاہیے ہوتی ہے جو اس دائرے کی اندرونی طاقت کے برابر باہر سے اس انداز میں پریسنگ فورس لگا رہی ہو جو توازن کے اصولوں پر قائم ہو۔ اسی اصول پر مولانا ابوالکلام آزاد نے قومیت کی تعریف یوں کی ہے:

> "قومیت انسان کی اجتماعی زندگی کے احساس و اعتقاد کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ یہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے۔"(۹)

قومیت کی وجہ سے قوم اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے اپنی ثقافت کو زندہ رکھتی ہے۔ جب قوم اجتماعی طور پر کسی برتری کی طرف جاتی ہے تو یہ احساس اس کے اندر اجتماعی شعور میں حب الوطنی کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ یہیں سے قومیت و وطنیت آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ ورنہ قومیت کے تشکیلی عناصر وطنیت سے بڑھ کر کہیں زیادہ ہیں۔

وطنیت قومیت کی ہی ایک شاخ ہے جس کو علاقائی یا جغرافیائی قومیت کہا جاتا ہے۔ وطنیت میں جذبہ حب الوطنی بھی ہوتا ہے اور ماں دھرتی کا مہابیانیہ بھی۔ جس کی خاطر جان دینے کو تیار رہا جاتا ہے۔ عہدِ قدیم سے یہ حل طلب مسئلہ رہا کہ وطنیت پہلے ہے یا قومیت؟ کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے، وہی اُس کا وطن ہے۔ اُسی نسبت سے ہی اُس کی قومیت شمار کی جائے گی۔ اِس لیے عہدِ قدیم میں وطنیت اہم تھی اور خاص طور پر بنیاد پرست قوموں میں یا غلام ذہن، احساسِ کم تری یا احساسِ برتری والے لوگوں میں یہ طریقہ رائج رہا اور چلا آتا ہے کہ وہ ناموں کے ساتھ کوئی شخصی، شہری، مسکنی وابستگی یا نسبتی حوالہ بطور لاحقہ استعمال کرتے چلے آئے۔ قومیت و وطنیت کے درمیان فرق کو جارج اورول نے اس طرح ثابت کیا ہے:

> "Nationalism is not to be confused with patriotism. Both words are normally used in so vague a way that any definition is liable to be challenged, but one must draw a distinction between them, since two different and even opposing ideas are involved.

By 'patriotism' I mean devotion to a particular place and a particular way of life, which one believes to be the best in the world but has no wish to force on other people. Patriotism is of its nature defensive, both militarily and culturally. Nationalism, on the other hand, is inseparable from the desire for power. The abiding purpose of every nationalist is to secure more power and more prestige, not for himself but for the nation or other unit in which he has chosen to sink his own individuality." (10)

اسی قومیت و وطنیت کے فرق کو سڈنی جے ہارس نے یوں بیان کیا:

"The difference between patriotism and nationalism is that the patriot is proud of his country for what it does, and the nationalist is proud of his country no matter what it does; the first attitude creates a feeling of responsibility, but the second a feeling of blind arrogance that leads to war." (11)

اسی فرق کو چارلس ڈی گال (سابق فرانسیسی وزیر اعظم) کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو:

"Patriotism is when love of your own people comes first; nationalism, when hate for people other than your own comes first." (12)

قومیت و وطنیت کا یہی وہ سادہ مفہوم ہے جو ہزاروں سال سے رائج رہا ہے اور انسانی فطری تقاضوں کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تشفی بھی کرتا رہا ہے تاہم صدیوں کا سفر کرنے والا یہ مفہوم اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل و اواخر میں اپنی معنویت کھو بیٹھا۔ اس وقت مذہب، ثقافت اور قومیت کی سہ گونی کو نئے انداز سے دیکھا گیا۔ مون زجر کا بیانیہ ہے:

"Peace-phobia is the outcome of nationalism and religion; while homophobia is the outcome of traditions and religion."(13)

اس بیانیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات بھی یاد رہے کہ کلیسائی مرکزیت کے خاتمے کے بعد کثیر القومی مغربی معاشروں اور ان کے نو آبادیات میں قومی سوال اس شدت سے ابھرا کہ انسانیت کو اپنے کُلی معاشرتی، سماجی اور وطنی نظریات کو از سرِ نو دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ دراصل وطنی اتحاد کے نام پر جمع، متضاد عصبیتوں کا ٹکراؤ تھا، جو بنیادی طور پر قومی سوال ہی کا پیدا کردہ تھا۔ عہدِ قدیم سے لے کر دورِ جدید تک جتنی بھی جنگیں ہوئیں؛ وہ سب جذبۂ قومیت کی وجہ سے ہوئیں۔ کسی قوم نے دوسری قوم پر حملہ کیا تو وہ بھی جذبۂ قومیت کی بنیاد پر اور دفاع کرنے والی قوم نے بھی محض جذبۂ قومیت کے تحت حملہ آور قوم سے مقابلہ کیا۔ الزبتھ گیسکل نے وطنیت کو دوسری تمام قوموں سے نفرت کرنے کی اساس پر قائم کیا ہے۔ یعنی وطنیت اسی صورت میں پیدا ہوگی اور پروان چڑھے گی جب دوسروں سے نفرت پیدا ہوگی۔ [۱۴] موپاساں نے وطنیت کو مذہب کی ایک قسم قرار دیا اور وہ انڈا کہا جس سے پیدا ہونے والے بچے کا نام جنگ ہے۔ [۱۵] اسی لیے جیمس برانچ کیبل نے قومیت و وطنیت کو جہنم کا مذہب قرار دیا۔ [۱۶] اسی نظریے کے حامل ہاورڈ زن نے ایک ایسا بلیغ جملہ لکھا کہ اس میں پوری تاریخِ انسان و تہذیب اور اس تہذیب سے جنم لینے والی قومیت و وطنیت پر نا صرف سوال اٹھا بلکہ اِس نظریے کی پوری تعریف بھی رد تشکیل میں سُنا دیتی ہے:

> ''There is no flag large enough to cover the shame of killing innocent people''.[17]

مضبوط عصبیت کی حامل قوموں کے خون خرابے اور استحصال کے ردِّ عمل نے سامراجی راج دھرم کے جبر پر غلبہ پانے کی خواہش کو جنم دیا جس کے نتیجے میں نو آبادکار قوتیں کمزور ہوتی گئیں اور بہت تیزی سے یکے بعد دیگرے محکوم آزاد ہونے لگے۔ غلاموں کو یہ احساس ہوا کہ ہم بھی قومیت کے بغیر ایک عظیم اجتماع میں بغیر لباس کے ہیں۔ ساکنانِ مشرق نے بھی ایسا ہی محسوس کیا اور ہندوستان جو متضاد اقوام، مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ تھا اور جہاں دراوڑ، منگول اور آریا قومیں آباد تھیں؛ ایک قوم بن گیا۔

اس مغلوبیت کے عہد میں محکوموں کے اندر میں یہ جذبہ دَر آنا فطری تھا۔ اسی لیے ہندوستان کا ہر ادیب و دانشور متحدہ قومیت کو لے کر جذباتی تھا۔ مگر قابضین نے ہندوستانی قومیت کو ایک کمزور تاریخی منظر نامے میں دیکھا۔ پرشیا کے شہزادے کو شہزادہ البرٹ نے ایک خط لکھا جس میں واضح پتا چل جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی عوام کو کس طرح دیکھ رہے تھے:

"ہندوستان کے لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کی اہلیت نہیں اور اسے قائم رکھنا تو قطعی اُن کے بس کی بات نہیں۔ باخوس اور نمرود کے زمانے سے آج تک ہندوستان برابر دوسری قوموں کا مفتوح و محکوم رہا ہے۔ ان میں آشوری، ایرانی، یونانی، تاتاری اور عرب شامل ہیں۔ ان فاتح قوموں نے ملکی عوام پر حکومت ضرور کی اور بقدرِ ضرورت انھیں دبایا بھی، لیکن انھوں نے نہ ہندوستانیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی نہ اُن کو اپنے اندر جذب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے لوگ باہمی اختلاط کے باوجود من حیث القوم کبھی متحد نہ ہو سکے۔"(۱۸)

مگر شہزادہ البرٹ کی بات کو رد کرتے ہوئے ڈاکٹر گستاؤلی بان نے ہندوستان میں تشکیلِ قوم کے امکانات کو بھانپا اور اس کے لیے پروفیسر شیلی کی بات کو پیش کیا:

"جس روز ہندوستان میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا، وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اور گو یہ احساس اس حد تک نہ بھی بڑھے کہ غیر قوم کو عملی طور پر ملک سے باہر نکال دینے کا جوش پیدا کر سکے بلکہ صرف اسی قدر خیال پیدا کر دے کہ غیر قوم کی حکومت کی اعانت شرم کی بات ہے تو اسی روز گویا ہماری حکومت ختم ہو جائے گی کیوں کہ ہماری فوج میں دو تہائی دیسی سپاہی ہیں۔"(۱۹)

یہی وہ خدشات جو ڈاکٹر گستاؤلی بان اور پروفیسر شیلی کو محسوس ہو رہے تھے، وہ پورے ہو کر رہے۔ ساری ہندوستانی قوم آزادی کے لیے ایک جگہ مجتمع ہو گئی جس سے تاجِ برطانیہ کو انتہائی خوف لاحق ہو گئے کہ مسلم اور ہندو ایک جگہ پر کیسے اکٹھے ہو گئے۔ یہی دور تھا جب اقبال بھی ہندوستانی قومیت کے گیت گا رہے تھے۔ اقبال نے متحدہ قومیت کے لیے نظم 'آفتاب' لکھ کر یہ ثابت کیا کہ ہندومت اپنی اصل الاصول کے اعتبار سے مشرکانہ نہیں۔ اسی بنیاد پر اقبال نے 'نیا شوالہ' کے عنوان سے اصولِ مذہب کی طرف رجوع کی دعوت دی۔ 'ہندوستانی بچوں کا گیت' چشتی و نانک کے نغماتِ وحدت ہی کے حوالے سے 'میرا وطن وہی ہے' کے الاپ کے ساتھ طلوع ہوا اور گونجا۔

ترانۂ ہندی بھی اسی حوالے سے ' مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' اور 'ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا' کا اعلان کر رہا تھا:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر وروما، سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا[۲۰]

ظاہر ہے کہ اس طرح سے اقبال وطنیت کے جغرافیائی معنوں کے قائل ہو کر اپنی ہندوستانی قوم میں جذباتیت کو فروغ دے رہے تھے۔ ان کا یہ نظریہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ کیوں کہ ہندوستان کے اندر اور باہر کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ انھیں اپنے وضع کردہ راستے کو چھوڑنا پڑ گیا۔ تحریکِ خلافت نے جہاں ہندو مسلم اتحاد کو ایک اکائی بنا دیا تھا، اس تحریک کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد میں دراڑ آ گئی۔ استعمار کو پتا تھا کہ اب جذبۂ قومیت کو تو ختم نہیں کیا جا سکتا، سو انھوں نے مذہبی اکائیوں کے اندر قومیت کے جذبے کو ابھار دیا تا کہ یہ ہندوستانی قوم آپس میں الجھ جائے اور ہماری طرف ملتفت نہ ہوں۔ چناں چہ ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ ہندوستانی مفہوم 'میں ' اور 'تو' کی صورت میں ڈھل گیا۔ ہندوستان کی اکثریتی مذہبی قومیت نے اپنے سابقہ اور پرانے دونوں حاکمین سے اسی مذہب اور زبان کی بنیاد پر بغاوت کر دی اور ہندوستان عملی طور دو قوموں میں بٹ گیا۔ یہ وہی بات تھی جو سر سید احمد خان بنارس کے کمشنر مسٹر الیگزنڈر شیکسپیئر کو کہہ دی جو ہو بہو سچ ثابت ہوئی:

"آج اِن فرقوں میں دشمنی نہیں لیکن آگے چل کر دونوں فرقوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کے باعث آپس میں سخت دشمنی پیدا ہو جائے گی۔ بشرطِ زندگی ہم آپ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔"[۲۱]

بعد میں یہی ہوا کہ دونوں فرقوں کے درمیان یہ بات چل پڑی تھی کہ جب انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر جائیں گے تو کیا ہو گا؟ وہ کس کو اقتدار سونپ کے جائیں گے۔ یہی عدمِ تحفظ مسلمانوں کو کھائے جا رہا تھا جب کہ ہندو

اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یہ سمجھ رہے تھے کہ ہزار سالہ محکومیت کے بعد اب ہماری حکومت آنے کو ہے۔ اس دو طرفہ تصور نے دونوں اطراف قومیت کو اس طرح برانگیخت کیا کہ دونوں قومیتیں ایک دوسرے کے سامنے کھل کر آ گئیں۔ یہاں تک کہ مسلم اکابرین و مفکرین نے اپنی خودی دریافت کر لینے کا عمل شروع کر دیا اور پوری طرح یہ سمجھ لیا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں تو ایک نام نہ ہونے کے باعث اور زبان زد عام الفاظ و مغالطہ انگیز فقروں کی وجہ سے غلط تاثر جا رہا ہے۔ عرب و ایرانی ہندوستانی مسلمانوں کو 'ہنود' کہتے اور لکھتے تھے۔ اس کے تحفظ کی بنا پر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اس کو اول بدل کر 'ہندی مسلمان' کہا گیا پھر اس پر بھی اعتراض ہوا تو 'ہندوستانی مسلمان' یا 'مسلمانانِ ہند' کہلانا پسند کیا جانے لگا لیکن اس بات کو چودھری رحمت علی نے انتہائی شدت سے لیا اور خود کو 'ہندوستانی' کہلانے میں سب سے بڑا خطرہ محسوس کیا۔(۲۲) یہی خطرہ اُن کو ایک الگ پہچان کی طرف لے گیا اور شناخت کے بحران نے انھیں اُسی لفظ سے ہی دور کر دیا جو خود مسلمانوں ہی کی ایجاد تھا۔ 'ہند' فارسی لفظ تھا جو دریائے سندھ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔(۲۳) اسی نسبت سے 'ہندوستان' اس علاقے کا نام تھا جو مسلمانوں نے وادیٔ سندھ کا رکھا تھا (جس پر آج پاکستان قائم ہے)۔ سرہند سے مغرب کی طرف 'ہندوستان' اور اُس کے مشرق میں 'بھارت' تھا۔ لیکن شناخت کے بحران یا مخلوط شناخت نے اس حد تک مجبور کر دیا کہ اِسی اصطلاح کو ہی بدل دیا جائے۔ کیوں کہ 'ہندو' اب جغرافیائی نام کی بجائے مذہبی نام بن گیا تھا جب کہ اسلامیوں، بدھوں، پارسیوں، سکھوں کی شناختی اکائی؛ لفظ 'ہندو' کے مفہوم بدلنے کی وجہ سے ختم ہونے لگ گئی تھی جو کہ سناتن دھرم (جسے اب ہندومت کہا جانے لگا ہے) والوں کی پہچان بن چکا تھا۔ اس لفظ کو ترک کرنا اس لیے ضروری سمجھا جانے لگا تھا کہ یہاں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ پہلے مسلمان حاکم ہندوؤں کے بارے متعصب تھے، بعد ازاں وہ ہندوؤں میں خواندگی کی زیادہ شرح اور کانگرس کی ایتھنک کی بجائے خاموش مذہبی بنیادوں کی وجہ سے خوف زدہ ہو گئے جس کی وجہ سے مذہب کا کردار اہمیت اختیار کر گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو قومیت کی تشکیل کی جانب دو عناصر نے مائل کیا۔ ایک کانگرس کی جانب سے ہندوستانی قوم بننے کے لیے اور دوسرا پیغام آل انڈیا مسلم لیگ کا تھا جس میں انہیں مسلم قوم بننے کی دعوت دی گئی تھی۔

ادھر اقبال کی نگاہیں ہندوستان سے باہر بھی دیکھ رہی تھیں۔ سامراجی قوتوں نے پوری دنیا میں افراتفری کا ماحول بنا دیا تھا۔ جب صرف ہندوستان عذاب میں تھا تو اقبال نے 'ہم سب ہندی ہیں اور ہندوستان ہم سب کا ہے' کا نعرۂ اتحاد بلند کیا۔ جب معاملہ عالمِ اسلام تک پھیل گیا تو اقبال نے وہاں بھی نعرۂ اتحاد 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' کے عنوان سے بلند کیا۔ اس لیے کہ ہندو کا ملجا و ماویٰ تو صرف ہندوستان تھا لیکن مسلمان صرف ہندوستان

تک محدود نہ تھے بلکہ دنیا کے ہر براعظم میں پھیلے ہوئے تھے۔ اقبال نے اس جگہ وطنی قومیت کی تعریف ہی بدل دی اور اب مسلمانوں کا دیس وہی بتایا جس میں وہ رستے بستے ہیں اور زندگی کرتے ہیں پس جہاں اسلام اور مسلمان ہیں، وہی مسلمانوں کا وطن ہے۔ یعنی اسلام اور وطن ہم معنی ہو گئے۔ اسلام اور وطن کو ہم معنی بنانے ہی کا دوسرا نام ' نیا شوالہ ' تھا مگر جہاں 'نیا شوالہ ' قائم تھا اس کی حفاظت میں کمر بستہ ہو جانا، جدید قوم پرستی کے تحت آ ہی نہیں سکتا تھا۔ 'نیا شوالہ ' متحدہ ہندی قومیت کی تلاش کا دوسرا نام تھا جسے قبول نہ کیا گیا تو حالات کے پیشِ نظر اقبال نے 'اسلام اور وطن' کو ہم معنی بنانے کے لیے 'ملی ترانہ' کہا:۔

ہے اگر قومیتِ اسلام پابند مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس نہ شام [۲۴]
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے (۲۵)

یعنی اقبال کے یہاں قومیت و وطنیت نے معنوی چولے بدل لیے۔ پہلے ان کے معنی جغرافیے سے نکلتے تھے، بعد میں مذہب سے نکلے۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے تھی، وہی اسلام کو مسلمانوں سے دے دی گئی۔ اپنے چھٹے خطبہ میں اقبال نے اس وطنیت کو اس طرز سے واضح کیا کہ اسلام ایسی وطنیت کے خلاف ہے جس کی بنیاد رنگ و نسل، وطن، ذات پات پر ہو اور جو اخلاق و مذہب سے بے نیاز ہو۔ ان کی نظر میں غیر سیاسی حب وطن ایک فطری نفسیاتی جذبہ ہے لیکن مغربی نظریہ وطنیت یا وطنی قومیت اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک انجمن اقوام ہے جس نے ہمارے قومی، وطنی، نسلی، جغرافی حدود و

امتیازات کو محض ایک تعارف کے طور پر تسلیم کیا ہے اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان یعنی مسلم ممالک اپنا اجتماعی نقطۂ نظر محدود کر لیں۔(۲۶) اسی تناظر میں اقبال گویا ہوئے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے (۲۷)

قابضین نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ہر ہر مقام پر انتشار کی غرض سے چھوٹی قومیتوں کو فروغ دیا۔ ان کو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی لگائی آگ مقامی قومیتوں کو تو ہمیشہ کے لیے آپس میں دست بہ گریباں رکھے گی ہی سہی مگر خود ان کے اپنے اقتدار کو بھی نگل جائے گی۔ یہاں تک کہ اقبال ایسے ہندی قومیت کے ہدی خوان بھی مذہبی قومیت میں ڈھل جائیں گے۔ اور لا محالہ طور پر اس نو ساختہ قومیت نے اپنی منتہٰی علاحدگی اور مسلسل انتشار پر ہی کرنی تھی چاہے اس طرف تمام ہندی رہنماؤں کا خیال تک نہ گیا ہو۔ اس بحث طلب مسئلے کو اشتیاق حسین قریشی نے سمیٹا کہ تحریک پاکستان کی جنگ کسی مملکت کے حصول کے لیے نہیں لڑی گئی تھی، اس جنگ کی تحریک اس خیال پر اور اس بنیاد پر مبنی ہے کہ ایک جداگانہ وجود کے بغیر قوم کی تخلیقی فطانت کے نابود ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر اس قوم کو آزادی اور قسمت آزمائی کا موقع مل جائے تو وہ قوم انسانی فکر کو پُرمایہ بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ کیوں کہ ہر قوم کا اجتماعی شعور و لاشعور الگ اور نرالے تجربے کا حامل ہوتا ہے۔ اس تجربے سے انسانیت کو جو مدد ملتی ہے اسے صرف وہ قوم ہی عطا کر سکتی ہے۔(۲۸)

اس طرح نو ساختہ قومیتوں نے نئے تجربات کر لیے مگر اپنی حدود کے اندر جغرافیائی قومیتوں کا انہدام نہ روک سکے جو ہنوز جاری ہے اور شاید یہ ایک نا مختتم عمل ہے جو بالآخر کسی نئے عمرانی معاہدے کی طرف یہاں کے لوگوں کو لے جائے گا۔

حوالہ جات

1 Steven Grosby, “Nationalism”, (New York: Oxford university press, 2005), P.44.

2 International Encyclopedia of the Social Sciences, (New York: MacMillan Company, 1930) Vol: II, P.08.

۳ گستاؤلی بان، ”تمدّنِ ہند“، مترجمہ: سید علی بلگرامی (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۲ء)، ص۱۱۸۔

4 Ernest Renan, “What is a Nation in Modern Political Doctrine”, (London: Oxford University Press,1939), P.203.

۵ اسٹالن، ” قوم اور قومیت“، مترجمہ: طفیل احمد خان، (لاہور: نیا ادارہ، سن ندارد)، ص۱۳۔

۶ جیلانی کامران، ”قومیت کی تشکیل اور اردو زبان“، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء)، ص۹۔

7 Harold J. Laski, “A Garammar of Politics”, (London: George Allen & Unwin Ltd, 1936), PP. 219:220.

۸ غلام احمد پرویز، ”انسان نے کیا سوچا“، (لاہور: ادارہ طلوعِ اسلام، ۱۹۸۶ء)، ص۲۰۳۔

۹ مولانا ابوالکلام آزاد، ”اسلام اور نیشنلزم“، (لاہور: سلسلہ مطبوعات البالغ بک ایجنسی، ۱۹۲۹ء)، ص۹۔

10 George Orwell, “Notes on Nationalism”,(First published: Polemic. GB, London, May 1945), (Reprinted: “England Your England and Other Essays”, 1953) http://orwell.ru/library/essays/nationalism/english/e_nat (Last modified on: 2015-09-24)

11 Sydney J. Harris, “Strictly personal”, (Washington: Henry Regnery Co., 1953), P. 27.

12 Charles de Gaulle, “The Complete War Memoirs”, (New York: Carroll & Graf Publishers, 1998),

ISBN 10: 0786705469 ISBN 13: 9780786705467 (https://www.goodreads.com/quotes/526167-patriotism-is-when-love-of-your-own-people-comes-first)

13 M.F. Moonzajer, "Love, Hatred and Madness", (eBook) "https://www.quotes.wiki/peace-phobia-is-the-outcome-of-nationalism-and/", Dated: 5.7.2017.

14 Elizabeth Gaskell, "Sylvia's Lovers", Ref: Ziauddin Sardar & Marryl Wn Davis, "Why Do People Hate America?", (New York: Disinformation Co., 2002), Chapter 5.

15 Guy de Maupassant, Ref: Herb Galewitz, "Patriotism", (New York: Dover Publications Inc., 2003), P. 37.

16 James Branch Cabell, (https://www.brainyquote.com/quotes/james_branch_cabell_3801 41) Dated: 12.5.2017.

17 Howard Zinn, "The Zinn Reader", (New York: Seven Stories Press, 1997), P.361.

۱۸ ہیکٹر بولا ئتھو، "محمد علی جناح"، مترجم: زُہیر صدیقی، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء)، ص ۶۰۔

۱۹ گستاؤلی بان، "تمدنِ ہند"، مترجمہ: سید علی بلگرامی (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۲ء)، ص ۲۳۴۔

۲۰ محمد اقبال، "کلیات اقبال (اردو)"، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلی شرز، ۱۹۹۶ء)، ص ۸۳۔

۲۱ ہیکٹر بولا ئتھو، "محمد علی جناح"، مترجم: زُہیر صدیقی، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء)، ص ۶۵۔

22 Ch. Rehmat Ali, "The Millat and Menace of Indianism", (Cambridge: The Pakistan National Movement,1940), P.11.

۲۳ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، (لاہور: پنجاب یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۹ء)، ج ۱۳، ص ۱۷۳۔

۲۴ محمد اقبال، ”کلیات اقبال (اردو)“، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۴۷۔

۲۵ ایضاً، ص ۱۶۱:۱۶۰۔

۲۶ محمد اقبال، ”تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ“، مرتبہ: سید نذیر نیازی، (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۴۴۔

۲۷ محمد اقبال، ”کلیاتِ اقبال (اردو)“، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلی شرز، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۶۰۔

۲۸ اشتیاق حسین قریشی، ”جدوجہدِ پاکستان“، مترجم: ہلال احمد زبیری، (کراچی: کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۱۔